● فرخندہ جمال

اختر شیرانی کی شاعری میں غیر رومانوی میلانات

Non-romantic elements in Akhtar Sheerani's poetry

Akhtar Sherani is one of the pioneers of modern Urdu literature and seem to be driven by all those trends and characteristics to some extent. Our modern literature has become a microcosm of its temperament after almost a century of Riyadh. Speaking of Akhtar Sherani's romantic poetry, Tawan's romance seems to flow in a light style with all its energy and sense. The characteristics of romance are more evident in Akhtar Sherani than in other poets. Akhtar did not make obsolete and obsolete articles of Urdu poetry the subject of his speech, but found life once again by blowing life out of the ordinary. Akhtar made valuable additions to Urdu romantic poetry. The ecstasy, fun, enjoyment, lyricism and music in his poetry give a new dimension to Akhtar's poetry. He avoids rotten traditions and turns his attention to imagination. He is brand new. Undoubtedly, Akhtar Sherani is a great romantic poet of Urdu literature.

Finding only romance in his poetry would be an injustice of Akhtar. In Akhtar's poetry, along with romance, non-romantic elements or inclinations are also very clear. Akhtar also looked at the rise of other modern poets, religious, military, moral, political and social issues and issues from a corrective point of view and experimented with it. In addition to serious poetry in this circle, examples of humor, satire and humor are memorable. Samples of Akhtar's non-romantic poetry include religious, moral poems, historical poems, social and corrective poems, words and political poems, poems for children and women, landscapes and miscellaneous

poems. Despite being devoted to romance, Akhtar has a special interest in realism and its usefulness. Even if Akhtar's romantic poetry is put aside and the other side of his poetry is highlighted, his status in it seems to be high in modern poetry. Meanwhile in this article Non-romantic poetry of Sheerani has been presented which shows that his poetry has multivalued.

● لیکچرر شعبۂ اردو، گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج، لطیف آباد نمبر ۸، حیدرآباد، سندھ۔ farkhunda1975@gmail.com

تخیل کی بلند پروازی اُردو ادب میں کوئی انوکھی اور نرالی چیز نہیں ہے اُردو شعرا نے اپنے طلسمِ خیال سے شاعری کو خانہ حیرت بنادیا ہے۔ اس میدان میں شعرا نے بڑے حوصلے دکھائے لیکن تخیل کی باگ اختر شیرانی نے جس رُخ پر موڑی وہ ایک نیا رنگ لیے ہوئے تھا، رومانی تخیل کی راہ کی وضاحت اختر شیرانی نے ہی کی۔ بوسیدہ روایات کو توڑا اور نئی روایات کو قائم کیا۔ الفاظ و تراکیب کو نئے معنی اور مفاہیم سے روشناس کر کے ترنم اور نغمگی کے احیاء میں معاونت کی۔ عشق میں انسانی اقدار اور ان کے بے باکانہ اظہار کی جرأت کی۔ عشق و محبت کے احساسات وجذبات کو پردوں میں چھپانے کے بجائے اردو ادب میں پہلی مرتبہ محبوبہ کو انسانی پیکر میں ڈھالا اور اس کے نام سے یاد کیا۔ عشق کی ماورائیت کو جسمانی آنچ سے آشنا کر کے فطرت سے ہم آہنگ کر دیا۔ آرزوؤں کے صنم خانے تراش کر ان کے سہارے زندگی گزارنے کی ایک نئی طاقت پیدا کی۔ ذہنی نشاط کے لیے ان کے کلام میں بڑا سرمایہ موجود ہے۔ مادیت کے اس دور میں جہاں مروت، ایثار، وفا اور خلوص و محبت کا کائی مقام شاذ ہی نظر آتا ہے۔ اختر کی شاعری نعمت غیر مرتبہ کے طور پر ابھرتی ہے۔ انھوں نے اعلیٰ انسانی اقدار کی پیامبری کی۔ ان کی شاعری قنوطیت کے بجائے رجائیت کی حامل ہے، اس میں زندگی سے پیار ہے اور تخیل کے سہارے زندگی کی کڑی دھوپ جھیلنے کا حوصلہ ہے۔ مشینی مصروفیات کے اس دور میں جب کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ تصور جاناں کیے بیٹھا رہے ذہنی سکون اور آسودگی کے لیے اختر کی شاعری ایک فرحت بخش ٹانک کا کام کرتی ہے۔ شاعری کی افادیت صرف یہی نہیں ہے کہ ہمارے علمی خزینے میں اضافہ کرنے کا باعث ہو یا مسائلِ حیات کے فہم کی تشریح کرے اور ان کے حل کے سلسلے میں ہماری رہنمائی کرے بلکہ اس کی افادیت یہ بھی ہے کہ وہ جادو اثر ہو اور تھکے ماندہ ذہن کو آسودہ کر سکے، لہذا اختر کی شاعری بڑی حد تک اس معیار پر پوری اترتی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ اختر اردو کے بہت بڑے رومانوی شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری میں صرف رومان ہی تلاش کرنا اختر کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اختر کی شاعری میں رومان کے ساتھ ساتھ غیر رومانی میلانات بھی بڑے واضح نظر آتے ہیں۔ رومانی شعرا کے یہاں یہ تضاد عام طور پر دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنے رومانی تصورات اور کیفیات سے شدید وابستگی رکھنے کے باوجود کبھی کبھی زندگی کے عملی مسائل پر بھی توجہ دیتے نظر آتے ہیں اور اس موقع پر وہ اپنے رومانوی تصورات و خیالات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ زندگی ایک اکائی ہے اور اسے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے، زندگی کے حوادث ایک دوسرے سے منسلک ہیں ایک شعبہ دوسرے شعبے سے اس قدر قریب ہوتا ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود بے معنی اور بے کار ثابت ہو جاتا ہے۔ زندگی میں حقائق اور فرار دونوں اپنی جگہ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اور ان سے روگردانی ممکن نہیں ہے، حقیقت اور رومان ایک ہی تصویر کے دورُخ ہیں ہم میں سے ہر شخص آرزوئیں، تمنائیں اور خواب رکھتا ہے اور س کی تکمیل چاہتا ہے اور ہماری یہ خواہشات رومانیت کی غماز ہوتی ہیں۔ ہمارا ہر خواب شرمندۂ تعبیر اور ہماری ہر آرزو تکمیل تک نہیں پہنچتی اور بعض اوقات ہم شدید جذباتی کیفیت کا شکار ہو کر ایک خیالی جنت میں پناہ لیتے ہیں جسے

یوٹوپیا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم بھی حقائق سے فرار چاہتے ہیں اور ذہن کی دنیا میں پناہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں جس کے لیے ہم کسی رومانی شاعر کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں حالاں کہ ایسا نہیں ہے خطرے سے آنکھ چرانے سے خطرہ ٹل نہیں جاتا البتہ نفسیاتی طور پر اس کا احساس کچھ وقت کے لیے دل سے نکل جاتا ہے ہمیں کبھی نہ کبھی ان خطرات کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر یونس حسنی کے بقول:

> ”رومانی شاعر دریا میں ایک مچھلی کی طرح ہے جو سانس لینے کے لیے کبھی نہ کبھی پانی سے منہ ضرور نکالتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کے اکثر رومانوی شاعروں اور ادیبوں کے یہاں رومانیت کے متوازی حقیقت نگاری کا میلان بھی ملتا ہے اور یہ کچھ اردو کے شعرا اور ادیبوں پر بھی منحصر نہیں۔ اس اصول کا اطلاق عالمی ادب پر بھی ہوتا ہے۔“[۱]

اختر شیرانی کے یہاں بھی یہ تضاد واضح طور پر نظر آتا ہے۔ دنیا کے سنگین مسائل سے بے زار ہو کر خوابوں کی جزیروں میں پناہ تلاش کرنے والا شاعر دوسری جنگ عظیم اور آزادی کی جدوجہد میں بڑی سرگرمی اور شدت دکھاتا ہے۔ حصولِ آزادی کے لیے اپنے عشق کو قربان کر دینے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ امیر و غریب کی تفریق، عورتوں کے ابتر سماجی حالات اور معاشرے کے دوسرے رسم و رواج جو نازیبا ہیں اس کے لیے اذیت کا باعث ہوتے ہیں وہ انھیں بدل ڈالنے کا خواہش مند ہے۔ اس کی رومانیت تھوڑی دیر کے لیے پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اختر نے بھی جدید دور کے دوسرے شعرا کی طرح مذہبی، قومی، اخلاقی، سیاسی اور سماجی موضوعات و مسائل کو اصلاحی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس پر طبع آزمائی کی۔ اس دائرے میں سنجیدہ شاعری کے علاوہ ظرافت اور طنز و مزاح کے نمونے بھی یادگار ہیں۔ اختر کی غیر رومانی شاعری کے نمونوں میں مذہبی اور اخلاقی نظمیں، تاریخی نظمیں، سماجی اور اصلاحی نظمیں قومی و سیاسی نظمیں، بچوں اور عورتوں کے لیے نظمیں، مناظر قدرت، مزاحیہ نظمیں، متفرق نظمیں شامل ہیں۔

مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اختر کے کلیات میں بہت سی نظمیں نظر آتی ہیں۔ قدما کے یہاں یہ رواج تھا کہ کلام کی ابتدا حمد یا حمد یہ مثنوی وغیرہ سے کرتے تھے، لیکن دورِ جدید میں یہ رواج تقریباً ختم ہو گیا۔ اختر کے زیادہ تر مجموعہ ہائے نظم کی ابتدا میں حافظ کی عاشقانہ یا رندانہ غزلیں یا ان کے بعض اشعار قلم بند کیے گئے ہیں یا پھر اختر نے فارسی میں بھی خود کچھ اس انداز سے لکھا ہے کہ وہ حمد کا قائم مقام معلوم ہوتا ہے۔ چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں:

خامہ ام رنگیں بیانی می کند ‎ ‎ در جوانی ہا جوانی می کند
باز سر بر پائے سلمائے سخن ‎ ‎ جرات سجدہ چکانی می کند
طائر افکار عرش آثار من ‎ ‎ ہا ملائک ہم عنانی می کند

"نغمہ حرم" کی دعا میں اختر کا مذہبی میلان نمایاں نظر آتا ہے۔" دعا بنام ایزد بخشائندہ داد گر" جس میں وہ اپنی گمراہی کے پیشِ نظر اللہ کے حضور بدست دعا ہیں:

الٰہیٰ مجھ کو ایسی نالہ سامانی عطا کردے جو بزم دہر میں ہنگامہ محشر بپا کر دے
اگر تیرے سوا بھی مدعا ہو سکتا ہے کوئی تو میرے دل کو یکسر بے نیازِ مدعا کردے

اختر کو آخری عمر میں اپنی بے مائیگی اور تہی دامنی کا احساس شدت سے ہو چلا تھا اس لیے اس دور کی شاعری میں مذہبی، سماجی اور اخلاقی، اصلاحی عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ بلآخر اختر اس احساس سے اپنا دامن نہ بچا سکے کہ جوانی کی خواب آسار ومانیت ان کے لیے مضر ثابت ہوئی اور ان کی پوری زندگی بے عملی کا نمونہ بن کر رہ گئی۔ یہ احساس زندگی کی ہزاروں تلخیوں کا نچوڑ ہے۔ ان تلخیوں نے ہی صحیح سمت میں اختر کی رہنمائی کی ہے۔ نظم "دعوت جہاں" میں اپنی بے عملی کا اعتراف کرتے ہیں جس میں ندامت اور اصلاح کا پختہ ارادہ نظر آتا ہے ملاحظہ ہو:

مسندِ عشق سے اُٹھ کر منزلِ پُرخار میں آ بزمِ جم چھوڑ کے بزمِ رسن و دار میں آ
عشرتِ کوہ کنی سے نہیں واقف پرویز کہہ دو یہ لطف اگر چاہے تو کہسار میں آ
تابکے بندگی ساغر و مینا اختر اب تو اُٹھ کے اللہ کے بندے صفِ احرار میں آ

طویل عرصے کی بے عمل زندگی نے اختر کے قوائے عمل کو زنگ آلود کر دیا تھا وہ کچھ کرنا اور کچھ بننا چاہتے تھے لیکن کوئی راستہ ہی نہیں سوجھتا تھا، اس لیے اللہ کے حضور اپنی قوتِ عمل کی بیداری کے لیے دعا کرتے ہیں:

چمن زارِ پُرفنا میں ایک مرغِ پُر شکستہ ہوں مجھے قدر آزمائے ذوقِ پروازِ بقا کردے
سکھادے طفیل دل درس اخلاص و محبت کا زبان کو بے نیازِ شکوۂ مکرودغا کردے

نعت اردو ادب میں ایک مستقل صنف کا درجہ رکھتی ہے۔ پرانے شعرا نعت کو قصیدے یا غزل کی صورت میں لکھا کرتے تھے لیکن اختر کا خلاق ذہن اس میں بھی اجتہاد سے کام لیتا ہے۔ روایت سے ہٹ کر انھوں نے نعت میں ایک نئی ہیئت اختیار کی جو گیت سے قریب تر ہے ایک بند ملاحظہ ہو:

بستی ہیں نظر میں
وہ چاندنی راتیں شاداب کھجوریں!
یا شرم و حیا سے سمٹی ہوئی حوریں!
زلفوں کو سنوارے سرشارِ مدینہ!
سرکارِ مدینہ!

قصیدے کی شکل میں نعت نگاری کا چلن اختر کے دور میں تقریباً ختم ہو چکا تھا اور نہ ہی یہ اختر کے مزاج کے مطابق تھا چنانچہ اختر نے نعت نگاری کے لیے یہی اسلوب اختیار کیا۔ پیغمبر اسلام سے اختر کو جو خاص شیفتگی اور شدید محبت تھی اس کا بھی یہ فطری تقاضا تھا چنانچہ اختر کی نعتوں کو پڑھتے ہوئے وہی سوز و گداز اور تغزل کی وہی مخصوص کیفیت محسوس ہوتی ہے جو غزل کے انداز میں لکھی جانے والی نعتوں میں ہوتی ہے۔ ان کی نعتوں میں خاص قسم کا سرور ہے۔ قربان ہو جانے کی شدید آرزو ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس دنیا کی ہست و بود کی زینت تمھیں سے ہے — اس باغ کی بہار کے ساماں تمھیں تو ہو
روشن ہے جو کی ضو سے شبستانِ زندگی — وہ ماہ نیم شبستاں تمھیں تو ہو
دنیا کی آرزوئیں فنا آشنا ہیں بس — جو روحِ زندگی ہے وہ ارمان تمھیں تو ہو
شادابیِ صنوبر و نسریں تمھیں سے ہے — بوئے گل و بہارِ گلستاں تمھیں تو ہو

چند اشعار اور ملاحظہ ہوں

لائی نسیمِ باد یہ خوشبوئے گیسوئے نبیؐ — قربان گیسوئے نبیؐ قربان خوشبوئے نبیؐ
گلہائے رنگیں جہاں رکھتے ہیں وقفِ ایں و آں — ہاں اے ہوائے گل فشاں لے آ ذرا بوئے نبیؐ

اختر کے کلام میں مذہبی منظومات بھی موجود ہیں جن میں "اسلام کا شکوہ" اور "شمع حرم" قابل ذکر ہیں۔ "اسلام کا شکوہ" میں مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ یاد دلائی ہے اور اسلام کی شکایت پر درد انداز میں پیش کی ہے:

سینہ عشقِ احمدیؐ سے دل مرا لبریز تھا — خندہ زن تھی اوجِ مہر و ماہ پر پستی مری
کاملانِ دہر کے سینوں میں تھا مسکن مرا — انبیائے عرش کا آغوش تھا گلشن مرا

مذہبی منظومات کے ساتھ ساتھ اختر نے اپنی کچھ نظموں میں اپنا اخلاقی نقطۂ نظر بھی مثبت یا منفی طور پر پیش کیا ہے۔ وہ دنیا میں اخلاص مروت، اخلاق اور اعلیٰ انسانی اقدار کی حکمرانی دیکھنا چاہتے ہیں ان کے سینے میں ایک درد مند دل دھڑکتا ہے اور جب ان کی نگاہوں کے سامنے ان اقدار کی پامالی ہوتی ہے جن پر ان کا ایمان ہے تو وہ تڑپ کر اس دنیا کی گھناؤنی تصویر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ اس دنیا کی تصویر جو خود دنیا والوں نے بنائی ہے:

سازِ دہر سے جاری حرص کے ترانے ہیں
فسق کے فسانے ہیں
مٹ گیا ہے ہستی سے ذوقِ پاک دامانی
نقشِ کیفِ روحانی

اس دنیا میں انسان کی حرص، ہوس اور حیوانیت نے حیاتِ انسانی کو جس طرح پامال کیا ہے اس کی تصویر کشی ایک نظم میں کرتے ہیں:

تمنائیں تڑپتی ہیں جہاں معصوم روحوں کی — مرادیں تلملاتی ہیں جہاں مغموم روحو ں کی
جہاں ہر سمت آفت ہے مصیبت ہے اذیت ہے — یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے
جہاں کا ذرہ ذرہ درس خونخواری سکھاتا ہے — جہاں حیراں ہے یزداں اور شیطاں مسکراتا ہے
جہاں حیوانیت ہر وقت مسرورِ بغاوت ہے — یہ دنیا دیکھنے میں کس قدر معصوم جنت ہے

اختر کے دور میں مغربی تعلیم عام ہو چکی تھی۔ جدید تہذیب نے پرانی تہذیب کے پرزے پرزے کر دیے تھے۔ زندگی بڑی تیزی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ روحانیت کی جگہ مادیت اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ اس صورت حال میں اختر نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ہم جس سمت بڑھ رہے ہیں وہ صحیح رخ نہیں ہے۔ وہ تہذیب جدید میں کوئی نمایاں وصف محسوس نہیں کرتے اور اس بے لگام مادیت کو برا خیال کرتے ہیں جس کی وجہ سے قوم اپنی قدامت پرستی سے دور ہوتی جا رہی ہے جس میں ان کے لیے فلاح کا راستہ ہے چنانچہ مادیت کو انسانیت کے لیے سم قاتل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

نوحہ زارِ عبرت ہے شہروں کی ویرانی ----- روح کی پریشانی
ظلمتِ تغافل میں گم ہے شمع عرفانی ----- نورِ فکر انسانی

اختر کی واضح اور دو ٹوک رائے ہے کہ اس دور میں روحانیت کے زوال کی وجہ خدا سے دوری ہے۔ جب تک ہم ذات مطلق پر کامل ایمان اور یقین نہیں رکھتے روحانیت کی اصل روح سے سرشار نہیں ہو سکتے۔ اس منزل کو صرف ایک ہی راستہ جاتا ہے۔ اختر نے یہ اعلان کر کے بیمار انسانیت کی صحیح نبض پر ہاتھ رکھا ہے:

کہ دنیا ہے بیگانہ عشق وفا سے — پھر انسانیت منحرف ہے خدا سے

اختر کے ہاں تاریخی رجحان اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جو حالی کی ''مسدس''، شبلی کے ہاں ''امید صبح'' اکبر الہ آبادی اور اقبال اور دیگر شعرا کی مختلف نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ یعنی ماضی کی تاریخ کو درس عبرت بنا کر اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے اس سے طاقت اور توانائی حاصل کرنا۔ ماضی پسندی کا یہ رجحان اصلاح اور افادیت سے بھرپور ہے۔ اختر بھی اس افادیت کو تسلیم کرتے ہیں ''شمعِ حرم''، '' اسلام کا شکوہ، مسلمانوں سے'' اور ''علی گڑھ کے طلباء'' جیسی نظمیں اس رجحان کی عکاس نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی نظموں میں اختر کا مخاطب مسلمان ہیں اور اختر نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے اپنے دور کے قومی شعور کی عکاسی کی ہے۔ کیوں کہ اس وقت برصغیر پاک و ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی اور اصلاحی تحریکیں مخالف سمتوں میں گام زن تھیں اختر علی گڑھ کے طلبا کو یہی درس دیتے ہیں کہ غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دل سوزی اور پامردی کے ساتھ جدوجہد کی جائے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کفر ہے برسرِ پرخاش پھر ایمانوں سے — اے صبا کہنا علی گڑھ کے غزل خوانوں سے
کہہ دو دنیائے سیاست کے صنم خانوں سے — چھیڑ اچھی نہیں اللہ کے دیوانوں سے
عمل و علم سے قائم ہے نظام اسلام — یہ نہ ترکوں سے، نہ عربوں سے نہ افغانوں سے

اختر کے نزدیک عمل کا جذبہ اور علم کے موتی ہم ماضی سے ہی چن سکتے ہیں۔ مسلم نوجوانوں کو اپنے ماضی سے توانائی حاصل کرنے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں:

ایک آزاد نفس عمرِ قفس سے بہتر — یہ سبق ملتا ہے خیبر کے کہستانوں سے
تم کو آتی نہیں گر طرزِ فغاں ہم نفسو!! — سیکھ لو وادیِ یثرب کے حدی خوانوں سے

اسلام کا شکوہ میں مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی کی یاد دلائی ہے کہ ماضی کی عظمت کو پھر سے استوار کیا جائے۔ مسلم غلامان فرنگ نے اسلام کی عظمت دیرینہ کو پامال کر دیا ہے اس کی تڑپ ان اشعار میں ملاحظہ ہو:

جس کیفیت میں گم تھی روحِ سلمان و بلالؓ — بادۂ عرفان کی وہ مستانہ لذت کیا ہوئی؟
جس کی ہیبت سے کبھی کانپ اُٹھتے تھے روم و فرنگ — تیری تکبیروں کی وہ مستانہ صولت کیا ہوئی؟
جس نے جا گاڑا تھا یورپ میں علم اسلام کا — آہ تیرے بازوؤں کی اب وہ طاقت کیا ہوئی؟
رو رہے ہیں آج تک جن کو کھنڈر اسپین کے — وہ حکومت کیا ہوئی وہ اس کی شوکت کیا ہوئی؟

ماضی کی اس یاددہانی میں مقصدیت ہے۔ پیغام عمل ہے ان تمام یاددہانیوں کا حاصل یہی ہے کہ :

اُٹھ رہا کر دل کو خوابِ عیش کی زنجیر سے　　گونج رہی تھیں فضائیں نعرۂ تکبیر سے

اختر کے ہاں اصلاحی رجحان صرف تاریخی منظومات تک موجود نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں ایک مستقل رجحان کی صورت میں نظر آتا ہے۔ اختر سے قبل اردو شاعری میں یہ اصلاحی رجحان ایک مؤثر رجحان کے طور پر موجود تھا چنانچہ اختر نے بھی جدید شاعری کے اس رجحان کے اثر کو قبول کیا اور اصلاحی نظمیں لکھیں۔ ان کی نظمیں ہندوستانی معاشرے کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیتی ہیں اور معاشرے کے یہ بدنما داغ ان کی نظروں سے چھپ نہیں پاتے۔ اختر مادیت پرستی سے سخت متنفر تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ معاشرے میں موجود طبقاتی فرق پر بھی ان کی نظریں تھیں۔ کسانوں کی حالت، غریبوں کا بھوک افلاس، تعلیم یافتہ طبقے کی مغرب زدگی، معاشرے کے بوسیدہ اور سڑے ہوئے رسم و رواج، عورتوں کے مسائل، خلوص و ایثار، مہمان نوازی، شجاعت کا فقدان جیسے دیگر مسائل ان کی نظموں کا حصہ بنے۔ اخلاقی قدروں، وضع داریوں اور روحانی لطافتوں سے وہ بے حد محبت کرتے ہیں اور دنیا کی بدلتی ہوئی رفتار کے باوجود ان سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ یہ درست ہے کہ ان کے ہاں معاشی اور اقتصادی جھگڑوں کی ایسی پیش کش جو کسی زبردست رد عمل کو جنم دے یا زیر دست پر زبردست کے مظالم کی ایسی تصویر پیش کرے جو ادب کو پروپیگنڈے میں تبدیل کر دے یا ان کے یہاں سماجی ناہمواریوں کی ایسی دھواں دھار تقریریں موجود ہوں جو نظم کو عوام کا نعرہ مستانہ بنادے۔ لیکن ان تمام مسائل کا شعور تو بہر حال ان کی نظموں میں نظر آتا ہے وہ انتہائی خلوص کے ساتھ مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں اور انھیں حالات کے بدلنے اور اچھے دن آنے کی نوید سناتے ہیں۔ وہ ان اقدار کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے جو انسانیت کا اعلیٰ جوہر کہلاتی ہیں۔ اس خلیج کے تحت امیروں کی امارت اور غریبوں کی غربت دن رات ترقی کرتی جاتی ہے۔ امیر و غریب کے درمیان ہمیشہ ایک وسیع خلیج قائم نظر آتی ہے۔ اس صورتِ حال میں اختر کے دل جذبات ایک طنزیہ مسکراہٹ کے طور پر ابھرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

دنیا کا ہر آرام امیروں کے لیے ہے　　پھر کون سی شے ہے جو فقیروں کے لیے ہے

بدبخت مریدوں پہ بھی یارب نگہ لطف　　مانا کہ جو نعمت ہے وہ پیروں کے لیے ہے

سرمایہ دار طبقہ ہمیشہ اپنی سفاکی کے لیے مشہور رہا ہے۔ ہندوستانی سیٹھ کی عیاری اور مکاری سنیے :

اک سیٹھ نے گندم کی یہ تعریف نئی کی　　کھانے کے لیے کب ہے ذخیروں کے لیے ہے

اختر کی اکثر نظموں میں کسان اور مزدور کی حیات کو سنوارنے کی باتیں ملتی ہیں اور اختر انسانیت کی تاریخ میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور ان سے ہمدردی رکھتے ہیں ہر دو طبقات کے لیے وہ روشن مستقبل کے آرزومند ہیں۔ ایک مزدور

کی زندگی عیش و طرب سے ناآشنا ہے مگر زندگی کی قوت تسخیر و عمل، ہماہمی اور حیات انسانی کی تعمیر اس کے حصے میں آئی ہے اور یہ ایسی شان اور امتیاز ہے جس پر یہ طبقہ جتنا بھی فخر کرے کم ہے:

قسمت دولت وجدان ہے یہ اندازۂ ظرف — رنگ و بو تیرے لیے سوز و شرر میرے لیے
خوف محنت سے نہیں، ہمدمِ آرام پسند — خون اور خاک تو ہے شہد و شکر میرے لیے
بوالہوس! آ کہ بہ اندازۂ ہمت خوش ہوں — .برگ و عمل تیرے لیے تیغ و تبر میرے لیے

جوش ملیح آبادی کی طرح اختر بھی کسان کو تہذیب اور حیات انسانی کا محسن خیال کرتے ہیں اپنی نظم کسان میں اسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

رگ رگ میں جوشِ محنت ذوقِ عمل ہے — کھیتوں سے آرہا ہے کسان اپنا ہل لیے ہوئے
دنیائے ہست و بود پر احسان اس کا ہے — خدمت گری زمانے کی ایمان اس کا ہے
گو محنت اور فکر سے فرصت نہیں اسے — قسمت سے پھر بھی شکایت نہیں اسے

اختر نے ہندوستانی سماج کے بعض تباہ کن رسم ورواج کی طرف بھی اپنی نظموں میں توجہ مبذول کرائی ہے اور ان روایات کو ہدف و تنقید بنایا ہے ان رسم ورواج میں نارضامندی یا زبردستی کی شادی بھی ایک بڑی لعنت ہے۔ ہمارا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے دو اجنبی جب رشتہ ازدواج میں منسلک ہوں تو ان کی باہمی رضامندی ضروری ہے لیکن اختر دیکھتے ہیں ہندوستانی معاشرے میں والدین کو اپنی اولاد کے ازدواجی امور پر جو ناجائز اختیار حاصل ہے اس کے نتائج بڑے تلخ اور تباہ کن نکلتے ہیں۔ زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ مسرتوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اختر بڑے تند و تلخ انداز میں اس کی مذمت کرتے ہیں:

بغیر مرضی کی شادی بھی کیا قیامت ہے — یہ عمر بھر کے لیے ایک مہیب لعنت ہے
ہے اس کا غم کدۂ ہند میں رواج بہت — بغیر مانگے ملا کرتے ہیں یہ تاج بہت
یہ وہ شادی ہے جسے والدین کرتے ہیں — ادا سمجھ کے ایسے فرضِ عین کرتے ہیں
یہ کچھ ضروری نہیں جانشیں راضی ہوں — یہ شرط ہے کہ فقط والدین راضی ہوں
جواں دلوں کو یہ شادی تباہ کرتی ہے — شگفتہ ہونٹوں کو مصروفِ آہ کرتی ہے

اس شادی کی تباہ کاریوں کو اختر مہلک خیال کرتے ہوئے اس سے سخت تنفر کا اظہار کرتے ہیں:

سرورِ زہر ہے یہ نورِ تیرہ فام ہے یہ　　　نشاطِ تلخ ہے یہ عشرتِ حرام ہے یہ
گلوئے عیش میں اک لعنتوں کا بار ہے یہ　　　سوادِ ہند میں شیطان کی یادگار ہے یہ
جواں روحوں کی خاموش قتل گاہ ہے یہ　　　خدا کے نام پہ سب سے بڑا گناہ ہے یہ

اختر کی نظموں میں مادیت پرستی اور روحانیت کے زوال پر بھی اکثر جگہ نوحہ ملتا ہے۔ وہ اعلیٰ انسانی اقدار کے حامی ہیں اور اس کی پامالی ان کے اندر ایک دُکھ اور کُڑھن کی صورت نظر آتی ہے۔ اختر کی اصلاحی نظموں پر نظر ڈالیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ سماج کی ان برائیوں پر ان کی نظر جاتی ضرور ہے، برہم بھی ہوتے ہیں، مٹادینے کے آرزومند بھی ہیں، مگر ان کا نقطۂ نظر رجائیت پر مبنی ہے۔ وہ پرامید ہیں کہ یہ تمام برائیاں آج نہیں تو کل ضرور مٹ جائیں گی لیکن اس امید کے باوجود ان کے خاتمے کے لیے وہ کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتے، کوئی راستہ نہیں دکھاتے، کبھی کبھی ماضی کا راستہ ضرور بتادیتے ہیں۔ ماضی کے دھندلکوں میں لپٹی ہوئی نظمیں ان کے نزدیک ایک روشن مستقبل لے کر آئیں گی یہاں آکر ان کا رومانی نقطۂ نظر واضح ہونے لگتا ہے جو انسان کو کچھ کرنے دینے کے بجائے صرف آس اور امید پر جینے کی راہ دکھاتا ہے اور اختر ان برائیوں کو مہلک جاننے کے باوجود اپنے اندر کچھ کرنے کی سکت نہیں پاتے۔ ان میں مقابلہ کی تاب نہیں صرف ایک سنہری آرزو ہے۔ اس آرزومندی نے ان کی اصلاحی نظموں پر بھی روحانیت کا ہلکا سا نقاب ڈال دیا ہے۔ اختر کے غیر معمولی رومانی رجحان کے پیش نظر یہ بات فطری تھی مگر سماجی اور اصلاحی سلسلے میں ان کا خلوص اور ان کی رجائیت پسندی کسی طور پر بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی۔

اختر کی اصلاحی نظموں کے ذیل میں بچوں کے حوالے سے ''پھولوں کے گیت'' اور خواتین کے جذبات کی ترجمانی ''نغمۂ حرم'' میں ملتی ہے۔ ان نظموں میں وطن دوستی، کھیل کود، شملہ، راوی، لکھنؤ، کشمیر، مناظر قدرت، شبِ برأت، ہوائی جہاز، گھڑی اور نئے سال پر، سبھی کچھ شامل ہے۔ بعض نظمیں صرف مناظرِ قدرت سے لطف اندوز ہونے کے لیے لکھی گئیں ہیں جیسے برسات، رات، چاندنی رات اور باغوں کی بہاریں وغیرہ، بعض کا موضوع اخلاقی سبق ہے لیکن نظموں کا مجموعی تاثر اتنا فطری نظر آتا ہے کہ شبہ بھی نہیں ہوتا کہ شاعر ارادتاً ناصح بننا چاہتا ہے اختر نے نظمیں لکھتے وقت بچوں کی ذہنی سطح کو خاص طور پر مدِ نظر رکھا۔ ان کی معصوم نفسیات اور ان کا ذوق و مذاق ان کے حساب سے نظر آتا ہے۔ ان کی نظموں میں وہی چلبلا پن اور وہی نمکینی نظر آتی ہے جو بچوں کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ اس سلسلے میں غلام عباس کی رائے ملاحظہ ہو جو وہ '' پھولوں کے گیت'' کے دیباچے میں پیش کرتے ہیں

> '' جناب اختر شیرانی جمالیات کے نہایت بلند پایہ شاعر ہیں۔ کائنات کے خوب و زشت میں صرف حسین چیزوں کو دیکھنا اور انھیں سرتاپا شاعرانہ نقطۂ نظر سے دنیا کے سامنے پیش کرنا ان کے شاعری کی سب سے بڑی

خصوصیت ہے اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ان کی شاعری کا یہ وصف بچوں کی نظموں کے اس مختصر سے مجموعے میں موجود ہے۔ وہی مناظر قدرت کی دل آویز تصویریں اور وہی اختر کی سحر طرازی، وہی لطیف تاثرات و حسّیات اور وہی اختر کی جذبات نگاری و نکتہ سنجی، وہی حیرت انگیز قدرتِ بیان، اچھوتی تشبیہیں اور استعارے، موزوں و دل نشین الفاظ، فرق صرف اس قدر ہے کہ ان نظموں کی زبان مقابلتاً بہت آسان، جذبات زیادہ لطیف اور خیالات زیادہ سریع الفہم ہیں۔ علاوہ ازیں اس کی دنیا بچوں کی پیاری دنیا ہے۔ ان نظموں میں بچوں کے جذبات کی ترجمانی ایسی خوش اسلوبی سے کی گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی کم عمر بچے میں کسی لطیفہ غیبی سے شعر کہنے کی قدرت پیدا ہو گئی ہو اور پھر وہ کم سن شاعر اختر شیرانی ہو۔[۲]

غلام عباس صاحب کی اس بھرپور اور جامع رائے کے بعد اختر کی ایسی منظومات کے بارے میں کچھ کہنا ضروری نہیں رہتا۔ مناظر قدرت کی عکاسی کے نمونے نظم ''برسات'' میں ملاحظہ ہوں:

باغوں کو دھونے آئے ہیں بادل
دریا اُٹھا کر لائے ہیں بادل
برسات آئی، برسات آئی
سرسبز شاخیں کیا جھومتی ہیں
جھک کر زمین کا منہ چومتی ہیں
آموں کو دیکھ کیسے لدے ہیں
آموں کے رسیا نیچے کھڑے ہیں

ننھا چرواہا شدید گرم دوپہر میں اپنا ریوڑ چرا رہا ہے، منظر کشی دیکھیے:

پہاڑ کے پاس ان ببولوں کو دیکھو چمکتے ہوئے زرد پھولوں کو دیکھو
جہاں سامنے بکریاں چر رہی ہیں نہیں گھاس پیٹ اپنا بھر رہی ہیں
وہیں ایک پیپل کا پودا لگا ہے اور اک ننھا لڑکا کھڑا گا رہا ہے
قریب اس کے لمبی سے لاٹھی پڑی ہے اور اک ننھی منی سی بکری کھڑی ہے

''قانون کی عزت''، ''شریر لڑکا''، ''اُس سے کہہ دوں گا'' ایسی نظمیں ہیں جو بچوں کے لیے بڑی سبق آموز ہیں لیکن نظمیں اس قدر سادہ اور آسان ہیں کہ ذہن پر ذرا بھی بوجھ نہیں پڑتا اور بچے نہایت آسانی کے ساتھ انھیں قبول کر لیتے ہیں۔

اختر کی بیش تر نظموں کا موضوع موسمِ بہار کی مست کر دینے والی فضااور جھولے ہیں۔اس موسم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے او خصوصاً بچیوں اور عورتوں کے لیے تو خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ باغوں میں جھولے پڑ جاتے ہیں، لمبی لمبی پینگیں بھری جاتی ہیں، چہلیں اور خوشیاں ہر طرف نظر آتی ہیں۔ایک لڑکی کی آرزو کی ترجمانی دیکھیے:

جہاں اونچے پہاڑوں پر گھٹائیں گھر کے آتی ہوں
ہوا کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہوں

ہو وہاں میں ہوں مری ہمجولیاں ہوں اور جھولا ہو

عورتوں کے متعلق جو نظمیں اختر نے لکھی ہیں وہ ان میں زیادہ کام یاب نظر آتے ہیں۔ مجموعہ ''نغمۂ حرم''، عورتوں کے دلی جذبات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔پردیس میں کسی کی یاد سے حسرت اور نا امیدی کا عالم طاری ہو جانا ممکن سی بات ہے کیوں کہ صدمے کے سبب انسان پر ایک خاص کیفیت کا وفور ہوتا ہے مگر جب اختر خود اپنی زبان میں اپنے نام سے مخاطب ہو کر الفاظ کے پردوں میں جذبات واضح کریں تو ذہن کی سمت کسی اور ہی جانب سفر کرتی ہے جو شعر کی مجموعی کیفیت ہوتی ہے۔اختر عورت سے بہت متاثر ہیں عورت ان کے یہاں مختلف حیثیتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ اس کی حیثیت کا اعتراف کرتے ہیں اور یہ انداز شاید ہی اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں مل سکے۔ عورت ان کے نزدیک محبوبہ، ماں، سہیلی، بیٹی، بیوی غرض ہر صورت میں رعنائی اور دل کشی کا باعث ہے۔ یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اختر صرف عورت کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ہر رشتہ اختر کے نزدیک اس کے مرتبے کے مطابق ہے اگر وہ ماں ہے تو ماں کے جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ماں کے متعلق ایسے ہی جذبات آمیز اور عقیدت مندانہ خیالات کا اظہار انھوں نے نظم '' مامتا'' میں کیا ہے۔ ماں کے جذبات کی عکاسی میں انھوں نے بڑی فن کاری دکھائی ہے۔ایک ماں اپنے ننھے بچے کو دیکھ کر جیتی ہے وہ اس کی کل کائنات ہوتا ہے۔اس کے لیے آرزوؤں کے حسین محل تعمیر کرتی ہے۔اس جذبات کا آئینہ دار نظم ''آخری امید'' ہے:

خدا رکھے جواں ہو گا تو ایسا نوجواں ہو گا
بہت شیریں زباں ہو گا بہت شیریں بیاں ہو گا
حسین و کامراں ہو گا، دلیر و تیغ راں ہو گا

یہ محبوب جہاں ہو گا
میرا ننھا جواں ہو گا

ہے اس کے باپ کے گھوڑے کو کب سے انتظار اس کا
ہے رستہ دیکھتی کب سے فضائے کار زار اس کا
ہمیشہ حافظ و ناصر رہے پروردگار اس کا
بہادر پہلواں ہو گا
میرا ننھا جواں ہو گا

اپنے جگر گوشے کو میدانِ کارزار کے حوالے کر کے اس کی نصرت اور حفاظت کی دعا کرنا صرف ماں کا ہی رتبہ ہے۔ ماں کے علاوہ عورت کے دوسرے روپوں کے جذبات کی اختر ترجمانی کرتے ہیں۔ دو عزیز سہلیاں جب بچھڑ جاتی ہیں تو عرصے تک ایک دوسرے کی یاد میں تڑپتی رہتی ہیں اس کا احساس صرف ایک عورت ہی کر سکتی ہے لیکن اختر نے ان جذبات کو الفاظ کا پیرہن عطا کر دیا ہے۔ ایک سہیلی کا پیغام دوسری کے نام، ایک سہیلی کی یاد سسرال میں، اسی نوعیت کی نظمیں ہیں۔ سسرال میں لڑکی کو اپنے میکے کی یاد کے ساتھ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گزارا ہوا وقت جس شدت سے یاد آتا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

رہ گزر پر ناز سے اب پھول برسائے گا کون   کیا کریں اب جا کے سوئے گلستاں تیرے بغیر
جا کے کہہ دینا سبک سارانِ سرحد سے صبا   غرقِ موجِ غم ہے دل کا کارواں تیرے بغیر
میری عذرا سے خدارا کوئی اتنا جا کہے   ہو رہے ہیں مہرباں نامہرباں تیرے بغیر

اختر کو عورت کا ایک روپ بہت بھاتا ہے اور وہ ہے '' شریک حیات '' جو اپنے شوہر کے دل سے قریب تر ہوتی ہے۔ اس کے رازوں کی امین ہوتی ہے۔ راحت دل و نظر چین ہوتی ہے۔ غرض شریک حیات ایک مرد کے لیے راحتوں کے پھول کھلاتی ہے اس کی خالی دنیا کو اپنی شخصیت سے جگمگا دیتی ہیں لیکن اختر کے ہاں زیادہ تر ہجرت زدہ عورت کی عکاسی ہے۔ جو کبھی شوہر کی یاد میں بے تاب ہے جس کی عکاسی '' پردیس پی کی یاد '' کبھی گاگر بھرتے ہوئے انتہائی غرق خیالات کے ارد گرد سے بے پرواہ اور کبھی شوہر کے تابوت پر ماتم کناں جیسی نظمیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ''نغمہ حرم'' میں جذبات کے لحاظ سے جو نظم بہت عمدہ خیال کی جا سکتی ہے وہ ایک نئی نویلی دلہن کے جذبات ہیں جب اس کا شوہر پردیس گیا ہوا ہے۔ ''پہلا خط'' میں اس نئی نویلی دلہن کے جذبات کی گل کاریاں اختر نے خوب کھلائی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لیلائے راز کا شوق کا محمل ہے ہاتھ میں
یعنی بجائے خامہ مرا دل ہے ہاتھ میں

احوالِ دل لکھوں، خلشِ مدعا لکھوں
رُکتی ہوں لفظ لفظ پہ آخر میں کیا لکھوں

دل اپنی دھڑکنوں کو چھپا جائے کس طرح
پہلے پہل کا خط ہے لکھا جائے کس طرح

گستاخی کا خیال جو آئے تو کیا کروں
دل شرم سے جو ہاتھ دبائے تو کیا کروں

مجھ سے بیانِ شوق کو ظاہر کیا بھی جائے
لکھنے کا حوصلہ ہے مگر کچھ لکھا بھی جائے

کر جائے گا خفا کہ ہنسا جائے گا یہ خط
اللہ کس نظر سے پڑھا جائے گا یہ خط

پہلے پہل کے خط میں کیا ماجرا لکھوں
کہہ دو یہ کیا لکھا ہے میں کہتی ہوں کیا لکھوں

اخترنے اس نظم میں جذبات کے تلاطم، حیااور شرم، جو ایک نئی دلہن کا خاصا ہے، کی اس قدر خوب صورت اور دل نشیں انداز میں عکاسی کی ہے کہ نظم گویا مجسم ہو جاتی ہے۔ اختر کے یہاں عورت کے معاملے میں صرف اور صرف ہجر کی کارفرمائی ہی زیادہ تر نظر آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ خود اختر کی زندگی ہجر سے عبارت ہے۔ انھیں کبھی وصال نصیب نہ ہو سکا۔ اس لیے ان کی نظموں میں ہجر کی پیش کش آسان ہو گئی ہے دوسرے عورت فطری طور پر حساس ہوتی ہے وہ مرد کے مقابلے میں غم اور افسردگی سے بہت جلد متاثر ہوتی ہے۔ اس سوگواری نے عورت کے حسن کو مزید دل کشی عطا کی ہے چنانچہ اختر بھی جنس مخالف کو دردِالم کی شدت میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے اختر نے کسی کو اپنی یاد میں بے قرار بھی دیکھا۔ انھوں نے ہجر کی کیفیات کو براہِ راست دیکھا ان کا عشق یک طرفہ نہ تھا دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی یہی وجوہات تھیں جنھیں اختر کو ہمیشہ ہجر زدہ عورت کے جذبات کی ترجمانی پر مائل کیا۔ عورت کے جذبات واحساسات کا ایک اہم ذریعہ گیت بھی ہیں۔ اختر نے گیتوں کی روایت کو برقرار رکھا مگر اس میں نت نئے تجربات بھی کیے۔ گیتوں کے سلسلے میں اختر نے ہندی کے عام فہم اور رسیلے لفظوں کو استعمال کیا۔ اختر کے زیادہ تر گیت ''طیورہ آوارہ'' میں شامل ہیں۔ ان گیتوں میں سے ایک عورت کی بے تابیاں اور بے قراریاں واضح ہو گئیں ہیں لیکن جذبات کی پیش کش میں عامیانہ پن اور گراوٹ ہر گز موجود نہیں ہے بلکہ ایک فطری حسن اور بے ساختہ پن ہے اور یہ پیش کش کبھی کسی سہیلی کے ذریعے یا پھر دل ہی دل میں دل میں کی گئی ہے یہ جذبات ہر کسی غیر محرم کے سامنے زبان پر ہر گز نہیں لائے گئے اور شاعر نے انھی بے زبان جذبات کو الفاظ کے ذریعے گویائی عطا کی ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

انھیں جی سے میں کیسے بھلاؤں سکھی مرے جی کو جو لبھا ہی گئے
مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے

رہے رات کی رات سدھار گئے مجھے سپنا سمجھ کے بسار گئے
میں تھی ہار گلے کا اتار گئے میں دیا تھی جسے وہ بجھا ہی گئے
سکھی کوئلیں ساونی گائیں گی پھر، نئی کلیاں بھی چھاونی چھائیں گی پھر
مرے چین کی راتیں نہ آئیں گی پھر، جنھیں نین کے نیر مٹا ہی گئے
مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں، سکھی چاہ کو من میں دبائے رکھوں
انھیں دیکھ کے آنسو جو آ ہی گئے، مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے

ایک گیت کے چند بول اور ملاحظہ ہوں:

اب تو آؤ پاس ہمارے دل کے سہارے آنکھ کے تارے
بیت چلیں مہتاب کی راتیں پیار کے میٹھے خواب کی راتیں
ہجر کے دن بھی کتنے گزارے اب تو آؤ پاس ہمارے

اختر کے ان گیتوں میں سادگی، گھلاوٹ، بے ساختگی، پاکیزگی اور حسن اور روایات کا پاس خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔

اختر کی رومانی شاعری ہو یا غیر رومانی ان کے یہاں قابل لحاظ تعداد میں مناظرِ فطرت کا بیان ہر سطح پر ملتا ہے۔ اختر کا یہ رجحان جدید شاعری سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے تحت جدید شعراء نے رسمی شاعری ترک کر کے فطرت نگاری کی طرف توجہ دی تھی۔ اختر نے موسم بہار کی دل فریب کیفیات پر خاص طور پر توجہ دی ہے جس میں ترانہ بہار، آمد بہار، نغمہ بہار، ابر سے، طلوع بہار، ماتم بہار، برکھا رت، جشن بہار اور فروغ سحر ایسی نظمیں ہیں جو اختر کی مناظر فطرت سے دل چسپی کو ظاہر کرتی ہیں۔ بہار کا موسم ایک رومان پسند شاعر کے لیے بڑی شادمانی اور دل کشی کا موسم ہے اور اختر جب ایسی نظمیں لکھتے ہیں تو سرمستی کے ساتھ ساتھ تشبیہات واستعارات کی نظم میں بارش کی طرح جھڑی لگ جاتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جلوۂ ہائے تازگی و رنگ آنکھوں میں لیے نشہ ہائے نغمہ و آہنگ برساتی ہوئی
کان میں پھولوں کے آویزے کر، پریاں دوش پر بادل کے زلفِ حور لہراتی ہوئی
عارضِ گل رنگ سے گل زار برسائے ہوئے دیدۂ میگوں سے میخانے سے چھلکاتی ہوئی

برکھارت کی دھوم ملاحظہ ہو:

گھٹاؤں کی نیلی فام پریاں افق پر دھومیں مچا رہی ہیں   ہواؤں میں تھرتھرا رہی ہیں فضاؤں کو گدگدا رہی ہیں
یہ مینہ کے قطرے مچل رہے ہیں کہ ننھے سیارے ڈھل رہے ہیں   افق سے موتی ابل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں
چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، مناظر سبزہ زار رنگیں   ہیں وادی و کہسار رنگیں کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں

''تاروں بھری رات''، ''برکھارت'' اور ''وادی گنگا'' میں ایک رات، شاعرانہ منظر نگاری کی بہترین مثالیں ہیں اب مناظر بیان کرنے کے لیے وہ تشبیہ و استعارات سے کام لیتے ہیں۔ مثلاً:

سرِ وادی ماہِ شام بہار   پروتی ہیں تاروں کے زریں ہار
یہ تارے ہیں یا حسرتوں کے چراغ ہیں   امیدوں کے پھول آرزو کے ایاغ
سر نیل ابھرے طلائی حباب   کہ زہرہ جبینوں کا رنگیں خواب
یہ آنسو ہیں حورانِ معصوم کے   کہ ارمان ہیں دلہائے مغمو م کے
نسیم چمن گنگنانے لگی   فضا وجد میں تھرتھرانے لگی
درختوں کے پہلو میں حورِ بہار   بجاتی ہے شاخوں کے رنگیں ستار

اختر کے مزاج میں مزاح کا رنگ بھی غالب نظر آتا ہے لیکن مزاح میں ان کا رجحان سماجی اصلاح کا ہے۔ انھوں نے زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں کو نشانہ بنا کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے اندر کچھ نہ کچھ مضحکہ خیز ہوں مثلاً:

شیخ جی موٹر پر حج کو جایئے   عہدِ نو میں اونٹ کام آتا نہیں
عاشقوں پر ظلم کرنا چھوڑدیں   کیوں بے قاصد جا کے سمجھاتا نہیں
بوسہ لیں اس سروقد کا کس طرح   تاڑ پر ہم سے چڑھا جاتا نہیں
حضرت ابن بطوطہ کی غزل   ضد کے مارے وہ صنم گاتا نہیں

اختر کے مزاح میں طنز کا عنصر بھی ملتا ہے۔ وہ صرف ہنسانے کے لیے ہی بات نہیں کرتے بلکہ مغربی اثرات کی خرابیوں کو بھی واضح کرتے ہیں۔ اس طنز میں عورتوں کے جدید فیشن، رقص و سرور کی محفلیں اور عریانی وغیرہ ملتے ہیں، رسم ورواج کے سلسلے میں وہ قدامت پرست واقع ہوئے ہیں۔ عورتوں کی گیسو بری پر طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لغات خانہ میں گیسو بری گو ایک گالی تھی　　　مگر گیسو بریدہ آج کل ہر ایک عورت ہے
فقط گیسو بری کا ذکر کیا ہے اس زمانے میں　　　کہ عریانی تن میں داخلہ تقلید فطرت ہے

برصغیر میں انگریزوں کے قبضے کے بعد ہندوستان کو اجنبی حکمرانوں سے آزاد کرانے اور جبر واستبداد کے پنجوں سے چھڑانے کے لیے ہر کوئی مستعد نظر آتا تھا۔ وطن سے محبت اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دینے کی آرزو دل میں کروٹیں بدلنے لگی تھی۔ اختر کی شاعری بھی اسی دور میں اپنے عروج پر تھی اور یہی زمانہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں ہندوستانی سیاست میں جوش وولولہ اور تیز رفتاری دیکھنے میں آتی ہے۔ حالات تیزی سے کروٹیں بدل رہے تھے ہر شخص اس سے متاثر ہو رہا تھا اور سیاست میں کچھ نہ کچھ دخل رکھتا تھا چنانچہ اختر کے یہاں بھی سیاسی موضوعات پر اظہارِ خیال جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ آزادی کی تمنا ہر اک دل کی آواز تھی اختر کے ہاں حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ یہ دونوں باتیں موجود ہیں۔ آزادی کی قدر و قیمت کو اختر اچھی طرح سمجھتے تھے ان کا ایمان ہے کہ:

ایک آزاد نفس عمرِ قفس سے بہتر　　　یہ سبق ملتا ہے خیبر کے کہستانوں سے

وطن کے لیے مر مٹنے کی آرزو ان کے دل میں ہمیشہ موجزن رہی وہ ہمیشہ میدانِ آرزو میں کھوئے رہے چنانچہ کہتے ہیں:

گل کی آرزو نہ گلستاں کی آرزو　　　سینے میں حشر خیز ہے میداں کی آرزو
پھولوں سے کھیلنے کا زمانہ گزر گیا　　　ہے دل کو جورِ خارِ مغیلاں کی آرزو

اختر دوسروں کو بھی جان کی بازی لگانے کی دعوت دیتے ہیں:

ہم نشیں آ، صفِ باطل کو پریشاں کر دیں　　　امن و ایماں کی بہاروں کو نمایاں کر دیں
خرمنِ ہستیِ اعدا کو جلا کر اس سے　　　کامرانی کی فضاؤں میں چراغاں کر دیں
جان جائے کہ رہے ملک کی خاطر ہمدم　　　دشمنِ ملک کو بے سر و ساماں کر دیں

اختر نے جنگ کے موضوع پر کئی نظمیں لکھیں۔ ان میں ''ایک جنگی ترانہ''، ''وطن کے شہیدانِ جنگ''، ''موسمِ بہار''، ''نعم البدل'' اور ''دلیرانِ وطن کے نام'' کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنگ میں کام آنا اور اس کے لیے تلوار کے گھاؤ کھانا ان کے نزدیک ایک اہم فریضہ ہے:

جنگ کا میداں ہمیں صحنِ چمن سے کم نہیں　　　بوئے خوں خوشبوئے نسرین و سمن سے کم نہیں
جذبہ حُبِ وطن سے خار بھی گل ہو گئے　　　دشتِ غربت ہم کو گلزارِ وطن سے کم نہیں

سپاہی ملک کا محافظ ہوتا ہے اس کا کام ہی ملک کا دفاع ہے۔ کاروبار زندگی سے ہٹ کر وہ اپنی قوم کی آزادی کے لیے برسرِپیکار ہوتا ہے۔ وطن کے سپاہی کو پیغام دیتے ہیں:

سر کٹا کر سرد سامانِ وطن ہونا ہے　　　نوجوانوں ہمیں قربان وطن ہونا ہے
اک نہ اک دن ہمیں گرجانِ وطن ہونا ہے　　　جان دینے کے لیے کیوں نہ ہوں اختر تیار

میدانِ جنگ میں محو نوجوانوں کو ہمت اور جرأت دلانے کے لیے ترانے گائے جاتے ہیں۔ اختر نے بھی ایک ترانہ وطن کے نوجوانوں کے نام لکھا جو اپنے رزمیہ اور غنائی تاثر کی وجہ سے بہترین ہے، اس نظم میں صوتی اور موضوعی ہم آہنگی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے "ایک جنگی ترانہ" کے بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دلاورانِ تیغ زن بڑھے چلو، بڑھے چلو!　　　بہادرانِ صف شکن ، بڑے چلو ، بڑھے چلو!
یلانِ زلزلہ فگن ، بڑھے چلو، بڑھے چلو!　　　غضنفرانِ پیل تن، بڑھے چلو، بڑھے چلو!
رکو نہیں، جو دشت و ریگ زار آئیں سامنے!　　　بچو نہیں جو سیل و جوئبار آئیں سامنے!
ہٹو نہیں، جو بحر و کوہسار آئیں سامنے!　　　ہو راہ کتنی ہی کٹھن، بڑھے چلو بڑھے چلو!

اسی قبیل کی ایک اور نظم " ساقی اٹھ تلوار اٹھا" ہے۔ اگرچہ یہ نظم ہندوستان کی تحریکِ آزادی سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتی مگر یونان کے ایک محبِ وطن رند شاعر کے حوالے سے ہے چوں کہ یونانی عرصے تک ترکوں سے برسرِپیکار ہے اور اپنی آزادی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ ایسے حالات میں ہر محب وطن کی یہی سوچ ہوتی ہے کہ اس کا وطن آزاد ہو۔ ایسی نظموں سے اختر نے جذبۂ جہاد اور جذبۂ آزادی کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثارِ آزادی جان میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ غاصب چھین نہ لیں ہاتھوں سے لوائے آزادی

وہ ہلہلۂ یلغار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ناموسِ وطن کو غیروں کے پنجے سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس اُن کی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں

لا برقِ فنا آثار اٹھا
اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

اختر شیرانی نے اس دور کے افغانستان کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر بھی نظمیں کہیں ہیں۔ دوسرے اختر افغانی النسل تھے اس لیے افغانستان کے حالات سے دل چسپی فطری تھی۔ برطانوی سیاست کے نتیجے میں افغانستان کے شاہ امان اللہ کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا اور اس کی جگہ بچہ سقہ حکمران ہوا۔ شاہی خاندان کے باحمیت افراد نے مسلح بغاوت سے بچہ سقہ حکمراں سے تاج و تخت واپس لیا۔ افغانستان کی سیاست کی ایک لمبی کہانی ہے۔ اس موقع پر "فتحِ کابل" کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں انگریزوں کی سیاست سے نجات پر مسرت کا اظہار کیا گیا ہے:

از غیب آمد --- یک مرد سنگی
فرشتہ پیکر --- باروئے سنگی
از سطوتِ او --- دل جان فرنگی
از ہیبتِ او --- لرزاں فرنگی
ضرعام پر دل --- شیر دلاور
اللہ اکبر --- اللہ اکبر

اختر کو جنگ کے موضوع سے بڑی دل چسپی ہے۔ انھوں نے بیش تر نظمیں جنگ کے موضوعات پر لکھیں مگر بنیادی طور پر وہ امن پسند ہیں۔ وہ ارتقا و تہذیب کے لیے اس کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ جنگِ عظیم کے خاتمے کا استقبال بڑی خوشی کے ساتھ کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

آزاد بلا ہو گئی لیلائے تمدن پھر جلوہ نما ہے رخِ زیبائے تمدن
لبریز مئے اس سے مینائے تمدن لا بھر کے لا گلابی مئے افرنگ کا دن ہے
اُٹھ ساقیا اُٹھ! خاتمۂ جنگ کا دن ہے

جنگ اپنے ساتھ کیا تباہ کاریاں لاتی ہے۔ اختر اس کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ اختر کا یہ خیال ہے کہ دنیا میں امن اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک طاقت کا توازن برقرار نہ ہو اس لیے وہ طاقت کو امن کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔ دنیا میں صرف وہی قومیں محفوظ رہ سکتی ہیں جنھوں نے اپنے تحفظ کے لیے طاقت کا استعمال کیا۔ اس کی مثال دوسری جنگ عظیم میں جاپان پر امریکہ کا ایٹم بم گرانا ہے کیوں کہ امریکہ کو یقین تھا کہ جاپان کے پاس جوابی کارروائی کے لیے کچھ موجود نہیں ہے۔ تیسری جنگ عظیم کا خاتمہ اس لیے ہو رہا ہے کہ امریکہ اور روس اس بات سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں جنگ کی صورت میں فقط ہلاکت اور تباہی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ "نغمۂ امن" میں اختر نے اپنے اس نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے:

ہم نشین آ! صف باطل کو پریشان کر دیں — امن و ایمان کی بہاروں کو نمایاں کر دیں
خرمنِ ہستیِ اعدا کو جلا کر اس سے — کامرانی کی فضاؤں میں چراغاں کر دیں
جاں جائے کہ رہے ملک کی خاطر ہمدم — دشمنِ ملک کو تو بے سروساماں کریں
امن کے نغمے پھر ایک بار سنائیں اختر — محفلِ دہر کو پھر رشکِ گلستاں کر دیں

ان کی ایک نظم جو سانیٹ ہے'' رہٹ کی آواز سن کر'' میں بھی جنگ کی صورت میں واضح نظر آتی ہے:

کوئی دھیمی سی نوا ہے کسی آہنگ کے بعد — کوئی شیریں سی ادا ہے جو ستاتی ہے مجھے
عالمِ خلد کا افسانہ سناتی ہے مجھے — جیسے روئی ہوئی آنکھیں ہوں کسی جنگ کے بعد

آخری مصرع اس بات کی دلیل ہے کہ جنگ کتنی ہلاکت آفریں ہوتی ہے۔ وہ جگہ جگہ امن کا نقطۂ نظر بھی واضح کرتے جاتے ہیں'' خرابیِ تعمیر'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نئے بنتے ہیں جب قصر کہن مسمار ہوتے ہیں — حریمِ امن بعد از جنگ ہی تیار ہوتے ہیں
خیابانِ جہاں کی کچھ وہی رونق بڑھاتے ہیں — خزاں کی قبر سے جو گل کدے بیدار ہوتے ہیں
ہر ایک زحمت دلیلِ رحمت خلاقِ باری ہے — جو سر بازی کے عادی ہوں وہی سردار ہوتے ہیں
خرابی میں نہاں ہے ہر نئی تعمیر کی دنیا — گلِ پامال سے جامِ حسین تیار ہوتے ہیں

لیکن اختر صرف اعلیٰ مقاصد اور قیام امن کے لیے جنگی تیاریوں کو جائز قرار دیتے ہیں، اس جنگ سے جو زمین کے لیے فساد ہو انھیں ہر گز عزیز نہیں ہے۔ جنگِ عظیم میں جاپان کی شکست پر بھی اختر خوش ہیں حالاں کہ جب امریکہ نے جاپان کے شہروں ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے تو اختر اس ظلم پر بہت افسردہ ہیں مگر جب جاپان ایک ظالم اور جنگ جو قوم کے طور پر ابھرا اور اس نے چینی قوم پر ظلم ڈھائے تو انھوں نے اس کی شکست پر اس طرح ملامت آمیز اشعار لکھے:

کہاں ہے آج وہ چینی غریبوں پر عتاب ان کا؟ — وہ بے کس عورتوں پر قہر، بچوں پر عذاب ان کا؟
دیا اک ذرّہ ناچیز نے آخر جواب ان کا، — مزہ دیکھو پربت کانپ اٹھا ایک رائی سے
وہ سورج بنسیوں کی اب حرارت کیا ہوئی آخر؟ — شہنشاہانہ عظمت اور شوکت کیا ہوئی آخر؟
وہ سپنا یعنی مشرق کی حکومت کیا ہوئی آخر؟ — وہ پندار اب کہاں جو بل کی لیتا تھا خدائی سے

اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اختر جنگ باز نہیں اور نہ شدت پسند ہیں بلکہ وہ قیامِ امن کے لیے اور اعلیٰ مقاصد کے لیے جنگ اور جنگی تیاریوں کو ناگزیر خیال کرتے ہیں اس کی ایک وجہ ان کا رومان بھی ہے۔ جنگ کا تصور ان کے

لیے رومان انگیز ہے۔ وطن کے لیے لڑنا اور جان دینا ان کا ایک سنہری خواب ہے۔ آزادی کو نوجوانوں کے خون سے گل رنگ دیکھنے میں نفسیاتی طور پر لذت پسندی نظر آتی ہے۔ اس لذت کے پیشِ نظر انھوں نے جنگ کے میدان کا موضوع منتخب کیا۔ انھیں میدانِ جنگ کی نقشہ کشی کرنے اور وہاں جا کر مرنے کی آرزو ضرور ہے لیکن عملی طور پر کچھ کر کے دکھانا ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ آزادی کے حسین خواب دیکھتے اور دکھاتے ضرور ہیں لیکن اپنی بے چینی اور بے عملی کا بھی انھیں احساس ہے اس نظم ''انقلاب اور مجبوری'' کے چند اشعار دیکھیں:

ذہن کو کیسے بدلیں آسمان کو کس طرح بدلیں		بتا ساقی کہ ہم بزمِ جہاں کو کس طرح بدلیں
ہے دل کو آرزو اک ساقیِ گل روئے کمسن کی		طریقِ کہنۂ پیرِ مغاں کو کس طرح بدلیں
مناسب ہے بدل دیں بجلیاں ہی راستہ اپنا		ہم اہلِ آشیاں اب آشیاں کو کس طرح بدلیں

عملی طور پر نہ سہی مگر ذہنی طور پر اختر بلاشبہ اس صف میں شامل ہیں جو آزادی کے کامل پرستار ہیں اور اس کے حصول کے لیے جوش و خروش سے لبریز ہیں:

بند ہے راہ مچلتی ہوئی تلواروں سے		کہہ دو آزادیٔ کامل کے پرستاروں سے

ہندوستان میں تحریک آزادی کا آغاز ہوتے ہی فرقہ وارانہ فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہوا۔ اگرچہ اس وقت بھی اختر نشے کے عالم میں مدہوش رہا کرتے تھے۔ لیکن اس عالم بے خبری میں بھی وحشت و بربریت کے واقعات سے بے نیاز نہ رہ سکے اور کئی عمدہ نظمیں انھوں نے لکھیں:

وہ پوچھتے ہیں سپہرِ بریں یہ کیا گزری		جنھیں خبر نہیں اہل زمین پر کیا گزری
ہوا ہے خبط انھیں خارجی سیاست کا		جو بے خبر ہیں اس سرزمین پر کیا گزری
خزاں نے لوٹ کے برباد کر دیا گلچیں		خبر تو لے کہ تری گل زمیں پہ کیا گزری

ان فرقہ وارانہ فسادات پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے اور ان کی اشک فشانی جاری ہو جاتی ہے:

ہے نہتے بے کسوں پر ہاتھ اٹھانا کب روا		شرم لیکن ظالموں کو شرم کب آنے لگی
پھر کوئی مظلوم تیر ظلم سے زخمی ہوا		پھر صدائے نالۂ صیدِ زبوں آنے لگی
اشک خونی سے ہوئی لبریز چشمِ سرگیں		دل سے آوازِ امید سرنگوں آنے لگی

اختر فساد زدہ ہندوستان میں ان فرقہ وارانہ فسادات کا اصل سبب جانتے تھے اور وہ اس کی تمام تر ذمہ داری قیادت پر ڈالتے ہیں کہ قائدین کی غلط پالیسیوں اور غلط فیصلوں نے عوام کو اس خون کے میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ نوجوان طبقے سے امید کی جاتی ہے کہ وہ باگ دوڑ سنبھالیں گے مگر ان نوجوانوں کو ہی آلہ کار بنا کر اس آگ میں جھونکا گیا جس کا شاخسانہ یہ ہے کہ جگہ جگہ

آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔اس موقعے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فساد کاری ہندوستان کو کیا کہیے سقر نہ کہیے تو جنت نشاں کو کیا کہیے

کوئی بتائے کہ ہو میرِ کارواں گمراہ تو جبر و گمرہی کارواں کو کیا کہیے

گنوادی عقل اگر بوڑھے رہنماؤں نے تو اس دیار کے ناداں جواں کو کیا کہیے

اس طرح جگہ جگہ اپنے خیالات کو شاعری کی صورت میں ڈھالا ہے یہ خیالات کہیں تو جھنجھلاہٹ میں تبدیل ہو گئے تو کہیں لاچاری اور کہیں بے کسی کی کیفیت بن گئے۔ تقسیم ہند کے بعد جو صورت حال پیدا ہوئی وہ اور بھی زیادہ خطرناک تھی۔ شہر کے شہر ویران ہو گئے۔ بستیاں تاراج ہو گئیں۔ مہاجرین کی ہجرت سے الگ نئے مسائل پیدا ہوئے جو لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر نئی ریاست میں داخل ہوئے وہاں کوئی پرسان حال نہ تھا۔اختر ان مصائب کو اچھی طرح سمجھتے تھے مگر اس کا مداوا ان کے پاس نہ تھا ان کی بے کسی عجب جھنجھلاہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ایک مہاجرہ کو لاہور میں کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر رو پڑے اور اس کی حرماں نصیبی کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا:

چمن سے دور ہوں ایک بلبل حزین و خموش ستا رہی ہو جسے یاد آشیانے کی

فلک نے چھین لی جس سے خوشی زمانے کی گلوں سے دور ہوں میں اک گل حزین و خموش

ہوائے خلد ہو دل میں تو خار بھی نہ ملے جو مر رہوں تو کنارِ مزار بھی نہ ملے

اختر کی غیر رومانوی شاعری کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے سیاسی رجحانات اور حالات کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے۔انھوں نے ہر قابل ذکر سیاسی تحریک کی حوصلہ افزائی اور جہاں اس کے ضرر رساں ہونے کا احساس ہوا اس کی طرف اشارے بھی کیے یعنی اختر کا سیاسی، سماجی اور قومی شعور ان کی رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ غیر رومانی شاعری میں بھی پختہ نظر آتا ہے وہ خود کوئی عملی کام نہیں کر سکے لیکن کچھ کرنے کے آرزو مند ضرور رہے۔ ملک و قوم کی زبوں حالی پر ان کے اندر دکھ کے طوفان اٹھتے رہے لیکن انھوں نے اس زبوں حالی اور تباہی کی طرف اپنی شاعری کے ذریعے حصہ ضرور ادا کر دیا۔پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں کہ:

> "ان کی نظموں سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ ان کی وطن دوستی اور آزادی پسندی کا جذبہ ہے۔ جس میں ریاکارانہ سیاسی جتھا بندی کے خیالوں کی آمیزش نہیں ہے۔ان کے جنگی ترانے میں خلوص ہے گو سیاسی شعور نہیں ہے اور ایک رومانی شاعری کا خلوص بھی اس کے کردار اور خیال کے متضاد پہلوؤں میں کیف، یک رنگی اور صداقت پیدا کرتا ہے۔" ۳۶

اختر کے کلام میں متفرق نظمیں بھی موجود ہیں جو کسی کی فرمائش، دوستوں اور عزیزوں کی شادی و سالگرہ کے موقع پر

لکھی گئیں ہیں۔ اختر کی کچھ نظمیں تصویری بھی ہیں یعنی جو چند خاص تصاویر کی تشریح کے طور پر کی گئیں ہیں۔ یہ نظمیں اتنی مکمل ہیں کہ اگر تصور یر سامنے بھی نہ ہو تو یہ گمان ہی نہیں ہوتا ہے کہ یہ نظمیں فرمائشی ہیں یہ اختر کی کام یاب مصوری کا ثبوت ہے یہ نظمیں وہی تاثر دیتی ہیں جو تصویر کو سامنے رکھ کر پڑھی جائیں۔

بہر حال اختر نے مذہبی، اخلاقی، سماجی، اصلاحی قومی، سیاسی، اور حریت ہر نقطہ نظر کو اپنی شاعری میں سمو دیا ہے ان کی غیر رومانی شاعری اس بات کی دلیل ہے کہ جدید اردو شاعری میں جن رجحانات کو فروغ ملا اختر کی شاعری میں بھی تقریباً وہی رجحانات موجود ہیں اگرچہ ان کی رومان پسندی ان کی غیر رومانی شاعری میں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے۔ اختر رومانیت سے سرشار ہونے کے باوجود حقیقت پسندی اور اس کی افادیت سے اچھی خاصی رغبت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جابجا اپنے عہد کے اہم مسائل کو اپنی شاعری میں تعمیراتی انداز میں پیش کیا ہے۔ البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس قسم کی شاعری میں گہرائی و گیرائی اور تاثر کی کمی نظر آتی ہے جو ان کی رومانی شاعری میں ہے، لیکن ان کی غیر رومانی شاعری نے جو وسعت اور رنگارنگی پیدا کی ہے وہ ان کے حلقۂ سخن کے لیے کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ ان کے یہاں مسائل حیات کا اوراک ضرور ہے مگر کوئی واضح لائحہ عمل موجود نہیں لیکن ان کے خلوص اور نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اختر کی رومانوی شاعر کو ایک طرف رکھ دیا جائے اور ان کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے تو بھی اس حیثیت سے ان کا جدید اردو شاعری میں ایک بلند مقام ضرور نظر آتا ہے اختر رومانی اور غیر رومانی شاعری دونوں حیثیتوں میں ایک کام یاب شاعر ٹھہرتے ہیں۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر یونس حسنی، '' اختر شیرانی اور جدید اردو ادب''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت ثانی ۲۰۰۹ء، ص ۲۴۶۔

۲۔ غلام عباس، ''پھولوں کے گیت'' از اختر شیرانی، دیباچہ، ص ۶، مشمولہ، اختر شیرانی اور جدید اردو ادب''، ص ۲۸۸ تا ۲۸۹۔

۳۔ سید احتشام حسین، ''تنقید اور عملی تنقید''، ص ۲۳، مشمولہ، ''اختر شیرانی اور جدید اردو ادب''، ص ۲۸۷۔

فہرستِ اسنادِ محوّلہ:

۱۔ حسنی، یونس، ڈاکٹر: ۲۰۰۹ء، '' اختر شیرانی اور جدید اردو ادب''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔